

دیوان غالب

به تصحیح متن و ترتیب

حامد علی خان

ديوان غالب

به تصحيح متن و ترتيب
حامد على خان

مطبوعه 1969

Lahore

Punjab University Press

1969



نقشِ نریدی ہے کس کی شوخی تحریر کا؛
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاؤ کاوِ سخت جا نہیائے تنہائی، نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا
جذبہ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینہ شیر سے باہر ہے دم شیر کا
آگہیِ دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھے
مُدعا غنفتا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بسکہ ہوں غالبِ اسیری میں بھی آتش زیر پا
مُوئے آتش دیدہ ہے حلفتِ مری زنجیر کا



جراحتِ شحفہ، الماسِ ارمغان، داغِ جگر ہدیہ
مُبَارک بادِ اسد، غمخوارِ جانِ دروِمنِ آیا





کہتے ہونہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زسیت کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا
دوستدار دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم!
اے بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
سادگی و پرکاری، بخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا
غنجِ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخمِ پرنک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا!





جُز قیس اور کوئی نہ آیا بہ رُوسے کار
صحرا اگر تیرنگی چشمِ حُود تھا
اشفتگی نے نقشِ سُوید کیا دُرست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبقِ ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بُود تھا
دھانپا کفن نے داغِ عیوبِ تیرہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ بُود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسد
سُرخِ شہِ خمارِ رُسوم و شُیود تھا





دلِ مِرا سوزِ نہاں سے بے مُحابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگِ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافلِ بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ غنقا جل گیا
عرض کیجے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحر ا جل گیا
دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کاغذِ ا جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا





شوق، ہر رنگ رقیب سرو سامان نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عیاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب
تیر بھی سینہ بسمل سے پرفشاں نکلا
بُکے گل، نالہ دل، دودِ چرخِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ تھا ماندہ لذتِ درد
کام یاروں کا بہت در لب و دندان نکلا
اے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب
اے جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا





دھمکی میں مر گیا جو، نہ بابِ نبِ دُرتھا
عشقِ نبِ مردِ پیشہ طلبگارِ مردِ تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگِ زردِ تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعہ خیال ابھی نہ دُرتھا
دلِ تاجگر کہ ساحلِ دریاے غل ہے اب
اس رگبزر میں حبِ لہو گل آگے گردِ تھا
جاتی ہے کوئی کشمکشِ اندوہِ عشق کی؟
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا دردِ تھا
احبابِ چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیالِ بیاباں نورِ تھا
یہ لاشِ بے کفنِ اسدِ خستہ جاں کی ہے
حقِ مغفرت کرے عجب آزادِ مردِ تھا





شمارِ سبجہ مرغوب بُتِ مُشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کفِ بُرونِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلی نو میدی جاوید آساں ہے
کُشاresh کو ہمارا صحتِ دہِ مُشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینہ بہ مہرِ متاع
کہ اندازِ بہ خوں غلتیدن بہل پسند آیا





دہر میں نقشِ وفا و جہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
سبزہ خط سے ترا کاکل کسرش نہ دبا
یہ زمرہ بھی حریفِ دہم افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزر گاہِ خیال مے و سمنہ ہی سی
گر نفسِ حبِ اوہ سمنہ نزلِ تقویٰ نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ بھی
گوشِ منت کشِ گلابِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قیمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدہ یکِ جنبشِ لب سے غالب
نا توانی سے حریفِ دہم عیسیٰ نہ ہوا

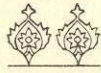




تسائش گر ہے زاہد اس مست در جس باغ رضواں کا
 بیاں کیا کیجیے بیدار کاوش ٹائے مڑگاں کا
 نہ آئی سَطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
 دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
 کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
 مری تعمیر میں مُضمَر ہے اک صورت خرابی کی
 اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر!
 خموشی میں نہاں خوگشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
 ہنوز اک پرتو نقشِ خیال یا رہا باقی ہے
 بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
 نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا

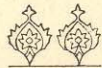
وہ اک گلہ ستہ ہے ہم بخودوں کے طاق نیلیاں کا
 کہ ہر اک قطرہ خوں دانہ ہے تسبیحِ مَرجاں کا
 لیا دانستوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
 مرا ہر داغِ دل اک تَحْنَم ہے سرو چراغاں کا
 کرے جو پرتو خورشید، عالمِ شبنمِ ستاں کا
 ہیو لی برقِ حُسن کا ہے خونِ گرم دھواں کا
 مَذاز آبِ کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
 چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں، گورِ غریباں کا
 دلِ افسردہ گویا محجوب ہے یوسف کے زنداں کا
 سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہاے پنہاں کا
 قیامت ہے سرِ شک آلودہ ہونا تیری مڑگاں کا

نظر میں ہے ہماری جاوہِ راہِ فنا، غالب
 کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا





محرم نہیں ہے تو ہی نواہے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبح بہارِ نظار ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا
تُو اور سُو غیبِ نظر ہائے تیز تیز
میں اور دُکھِ تری مژہ ہائے دراز کا
صرف ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
میں بیکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشہ بساط ہے سرِ شیشہ باز کا
کاوش کا، دل کرے ہے تقاضا کہ بیہنوز
ناخن پہ قرضِ اس گروہِ نیم باز کا
تاراجِ کاوشِ غمِ حبلِ ہوا، اسدا
سینہ، کہ تھا دینہ گہ ہائے راز کا





بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
شب ہوئی، پھر خُجُومِ حُسن کا منظر کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کھاؤں فریب
گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں گو نہ پاؤں اُس کا بھید
ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
مُنہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھ گیا
کیوں اندھیری ہے شمسِ ہم ہے بلاؤں کا نزول
کیا رہوں غربت میں خوش جب بحوادث کا یہ حال
رکھو یا رب یہ دُکھِ بے گھر کھلا
اِس تکلف سے کہ گویا بُتکدے کا در کھلا
اُتیں میں دُشمن نہ نہاں، ہاتھ میں شتر کھلا
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری سپیکر کھلا
حُسن کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے مُنہ پر کھلا
چتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدِ خست کھلا
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ برکشت کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں مینِ میسے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گیت بد بے در کھلا





شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابر آب تھا
شعلہ جوالہ ہر اک حلفتِ گرداب تھا
واں کرم کو عذیر بارش تھا عناں کی غلام
گریے سے یاں پنبہِ بارش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پر و نے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہِ نایاب تھا
جلوہِ گل نے کیا تھا واں چراغِ اُمنِ آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سر پر شورِ پنجابی سے بھتا دیوارِ جو
واں وہ منہِ نازِ محوِ بارشِ کنخاب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن، شمعِ بزمِ بخودی
جلوہِ گل واں بسا صُحبتِ احباب تھا
فرش سے تاعش واں طُوفانِ تھاموچِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسمان تک سوختن کا باب تھا



ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ حبِ گردِ دلِ عیتِ مرگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتم یک شہرِ آرزو
توڑا جو تُو نے آئینہ، تیشال دار تھا
گلیوں میں میری نقش کو کھینچے پھرو، کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ ہزار تھا
موجِ سراپِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ، مثلِ جوہرِ تیغ، آبِ دار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی عنمِ عشق کو، پر آب
دیکھا تو کم ہوئے یہ عنمِ روزگار تھا





بیکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاں ہونا
وے دیوانگی شوق کہ ہم دم مجھ کو آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ ازبکہ تقاضاے نگہ کرتا ہے جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مڑگاں ہونا
عشرتِ قتل کہ اہل تمنا، مت پوچھ عیدِ نطارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغ تنائے نشاط تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارہ دل، زحمتِ تمنا کھانا لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جھاسے توبہ ہاے اُس زود پشیاں کا پشیاں ہونا

حیف اُس چار گریہ کپڑے کی قیمتِ غالب!

جس کی قیمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا





شبِ خمِ شوقِ ساقی رتخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانہِ خمیازہ تھا
یک قدمِ وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ، اجڑائے دوعالمِ دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشتِ خرامیہاے لیے کون ہے؟
خانہِ مجنونِ صحرَا اگر دے دروازہ تھا
پوچھ مت رُسوائی اندازِ استغنائے حُسن
دستِ مرہونِ حنا، رُخسارِ رہینِ غارہ تھا
نالہٴ دل نے دیے اوراقِ لختِ دلِ برباد
یادگارِ نالہٴ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا





دوست غمخواری میں میسر ہی سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ منہائیں گے کیا
حضرتِ ناصح گراہیں، دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھ دو کہ سمجھائیں گے کیا؟
آج وال تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں ہیں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھائیوں سہی
یہ بے نونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراہٹیں گے کیا
ہے اب اس معمورے میں قحطِ عینِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ ولی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟



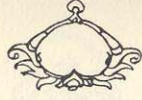


یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی تھنار ہوتا
ترے وعدے پر جیسے ہم تو یہ جان بھڑوٹا جانا کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر عمتِ بار ہوتا
تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا کبھی تُو نہ توڑ سکتا، اگر اُستوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نکیش کو یہ خلیش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوستِ ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگر چہ جاں گِل ہے، یہ بچیں کہاں کہ دل نہ غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غمِ بربلا ہے مجھے کیا بُرا تھا مرنے، اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ بیا نہ کبھی جبنا زہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا کہ گمان نہ ہے وہ مکتا جو دُئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیانِ غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا





ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مرا کیا
تجھ سے پیشگی سے معا کیا کہاں تک لے سراپا ناز کیا کیا
نوازِ شہائے بحیبِ بکھیتا ہوں شکایتہاے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں تغافلہاے تمسکین آزا کیا
فروغِ شعشعہ رخسِ یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا
نفسِ موجِ محیطِ بخودی ہے تغافلہاے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے غمِ آوار گہائے صبا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ "انا البحر" ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھا کیا
محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا ٹوٹا کیا
سُن لے عنایتِ تکرِ جنسِ وفا، سُن شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
کیا کس نے حبِ گداری کا دعویٰ؟ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ قاتل وعدہ صبر آزا کیوں؟ یہ کافرِ فتنہ طاقتِ ربا کیا

بلاتے جاں ہے، غالب اُس کی ہر بات

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا!





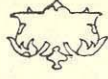
درِ خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں، کہ ہم
سب کو مقبول ہے دعویٰ ترمی مکتانی کا
کم نہیں نازِ شش ہمنامی چشمِ خواباں
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک گیا
نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب
قطرے میں وجہ دکھائی نہ دے اور جزو میں گل
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
رُوبرُو کوئی بُتِ آئینہ سیما نہ ہوا
تیرا ہمیں، بُرا کیا ہے، گرا چھا نہ ہوا
خاک کا رِزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
کام میں میرے ہے جو فرت نہ کہ برپا نہ ہوا
حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا
کیل لڑکوں کا ہوا، دیدِ بیانا نہ ہوا

تھی خنجرِ گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرنے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا



اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سرو پا ہیں
کہ ہے سرِ نخبہ مرگانِ اہوِ پشتِ خارا پنا





پے نذرِ کرم شمع ہے شرمِ نارسائی کا
بہ خوں غلتیدہ صد رنگِ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حُسنِ تماشا دوستِ رُسوا بے وفائی کا
بہ مہرِ صدفِ ثوابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکاتِ حُسنِ دے، اے جلوۂ بنیش، کہ مہر آ
چراغِ حنائی درویش ہو کا سگر گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم، غافل! تیری گردن پر
رہا مانند خونِ بے گنہ حقِ آشنائی کا
تمنائے زباںِ محوِ سپاس بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دستِ پائی کا
وہی اک بات ہے جو یاقوتِ نفسِ و انجمنِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری نگینِ نوائی کا
دہانِ ہر بُتِ پینارہ جو زنجیرِ رُسوائی
عدمِ تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا
نہ دے نامے کو اتنا طولِ غالب، مختصر لکھ دے
کہ حسرتِ سنجِ ہوں عرضِ ستمِ بانی کا





گر نہ اندوہِ شبِ فُرقَتِ بیاں ہو جائے گا بے تکلف، داغِ مہرِ دہاں ہو جائے گا
زہرہ گر ایسا ہی شامِ بھر میں ہوتا ہے آب پرتوِ مہتابِ سیلِ خانماں ہو جائے گا
لے تو لوں سوتے میں اُس کے پائو کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ کافرِ بگماں ہو جائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھتے تھے، کیا معلوم تھا یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحان ہو جائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا مجھ پہ گویا اک زمانہ مہراں ہو جائے گا
گر نگاہِ گرمِ منِ راتی رہی تسلیمِ ضبط شعلہ خُش میں جیسے خوںِ رگ میں نہاں ہو جائے گا
باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر ہر گلِ تر ایک چشمِ خوںِ رقتاں ہو جائے گا
وے گر میرا ترا انصافِ محشر میں نہ ہو اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسد

دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا





دروِ منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں قیہوں کو اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے فرا نہ ہوا
ہے خنجر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی حُدا ہی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھا کام گر رُک گیا، روا نہ ہوا
رہنی ہے کہ دِلستانی ہے لے کے دِل، دِلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سرا نہ ہوا





گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا گھر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
 یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاؤں مکتوب ! مگر ستمزدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا
 خائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا
 غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خند لائے بے جا کا
 ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا
 دل اُس کو پہلے ہی ناز و اداسے دے بیٹھے ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا
 نہ کہہ کہ گریہ بہت دار حسرت دل ہے مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسد
 جنائیں اس کی ہے انداز کار فرما کا



قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا خط جام مے سرا سر، رشتہ گوہر ہوا
 اعتبار عشق کی خانہ حسرتی دیکھنا غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

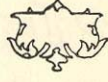




جب بہ تقریبِ سفیر نے محلِ باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اکِ دلِ باندھا
اہلِ بنیش نے بہ حیرت کئے شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسِیلِ باندھا
یاس و اُمید نے یکِ عرَبہِ میدانِ مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائلِ باندھا
نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضمونِ غالب
گرچہ دلِ کھول کے دریا کو بھی ساحلِ باندھا



میں اور بزمِ مے سے یوں شہِ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھوڑے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخنِ گرہ کُشا تھا



نہ تھا کچھ توحید تھا، کچھ نہ ہوتا توحید ہوتا
ڈوبو یا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا اگر حبِ داتن سے تو زانو پر دھسدا ہوتا

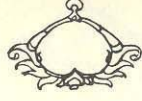
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا



سراپا رہیں عشق و ناگزیرِ اُلفتِ مہستی
عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور افسوسِ حائل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریاے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں سہل کا





یک ذرّہ زِیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فِتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگِی
کھینچا ہے عجبِ حوصلہ نے خطِ ایام کا
بُلبُل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ٹائے گل
کہتے ہیں جس کو عشقِ حائل ہے داغ کا
تازہ نہیں ہے نہ شکرِ سُخنِ مجھے
تِریاکیِ قدیم ہوں دُودِ چراغ کا
سوارِ بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عُدو ہے فراغ کا
بے خُونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہِ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سُراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہارِ خُمکدہ کس کے داغ کا





وہ مری چینِ حبیب سے غمِ نہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطی عنوان سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ حنہ
رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے پیشِ شعلہ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضُعف نے راحتِ طلبی
ہر قدم سائے کو میں اپنے شہستان سمجھا
تھا گریزاں مژدہ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفا دار اسد
غلطی کی کہ جو کامنہ کو مسلمان سمجھا





پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل ہجرتِ شہ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا، یعنی پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی، اے حسرتِ دل! نالہ کرتا تھا ہجرتِ یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا رہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا حُسد میں گم یاد آیا
آہ وہ جُرأتِ فریاد کہاں دل سے تنگ آ کے ہجرتِ یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال دل گم گشتہ، مگر، یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے! دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
نگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا





ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے، مگر کوئی عنایاں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا کلمہ اُس میں کچھ شائبہ خوبیِ تفتدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پستِ بتلا دوں؟ کبھی فتراک میں تیرے کوئی پنخیر بھی تھا
قید میں ہے تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک رنجِ گرنہباری زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لبثتہ تقریر بھی تھا
یوسف اُس کو کونوں اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی گر گہڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غمِ کوہ کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام ہم ہی آشفقہ سروں میں وہ جوائیر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں استادنیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا





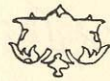
لب خشک در تنگی مُردگان کا زیارت کند ہوں دل آزر دگان کا
ہمہ نا اُمیدی، ہمہ بدگسانی میں دل ہوں فریبِ فخور دگان کا

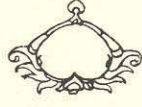


گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو سیا باں ہوتا

تنگی دل کا گلہ کیا یہ وہ کامند دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

بعد یک عُمَرِ وَرَع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا





تُو دوست کسی کا بھی، ستکار نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا منہ شب کی طرح دستِ قضا نے
خوشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں مُتَقَدِّرِ فِتْنہ، محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل، آزر دگئی یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوقِ مُکَرَّر نہ ہوا تھا
دریاے معاصی ٹنک آبی سے ہوا خشک
میرا سِرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
جاری تھی اسدِ دارغ جگر سے مری تحصیل
اتشکہ جاگیرِ سمن در نہ ہوا تھا



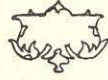


شب کہ وہ مجلسِ منورِ خلوتِ ناموس تھا
ریشہ ہر شمعِ خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے جہنا
کسِ متدربِ یاربِ ہلاکِ حسرتِ پانوس تھا
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جزِ شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ، گویا، یک لبِ افسوس تھا
کیا کروں بیمارِ میِ عنہم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل، بے منتِ کیموس تھا



آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ مایہ
اُس کی خطا نہیں ہے یہ سیرِ اقصوور تھا





عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کُشتہ، درِ خورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی آئے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوے قابل نہیں رہا
برُروے شمشِ جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں ہستیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
واکر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از بنگاہِ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہاے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصلِ سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدارِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اس
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا





رُشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حقیقت
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
ذَرّہ ذَرّہ ساغرمے خانہ نیرنگ ہے
گردِشِ مجنوں بہ چشمکماے لیلیٰ آشنا
شوق ہے سماں طرازِ نازش اربابِ عجز
ذَرّہ، صحرا، دستگاہ و قطرہ، دریا آشنا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنجِ رشکِ ہمدگیر نہ رہنا چاہیے
میرا زانوِ مونس اور آئینہ تیرا آشنا
کو کہنِ نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا، آسد
نگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا





فکر اُس پر ہی کوشش کا، اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیبِ آسمانِ تجا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یا رب آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحان اپنا
منظر اک بلمِ دری پر اور ہم بنا سکتے عرش سے اُدھر ہوتا، کاشکے ہماں اپنا
وے وہ جس قدر ذلت ہم تنہی میں ٹالیں گے بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسِ ثباں اپنا
دورِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلاؤں انگلیاں نگار اپنی جنامہ خوشچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبتِ بدلا ننگِ سجدہ سے میرے، ننگِ آستان اپنا
تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو دوست کی شکایت میں ہم نے ہنرِ باں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں کیلتے تھے
بے سبب ہوا غالبِ دشمن آسمان اپنا



سُرمۂ مُفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے کہ رہے چشمِ حسدِ یار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مہبِ داغِ عالم تیرے چہرے سے ہو ظاہرِ غمِ پنہاں میرا





غافل بہ ہوسم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانہ صبا نہیں طسّر گیاہ کا

بزم قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ، کہ رنگ
صیدِ زدام جستہ ہے اس دامگاہ کا

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں، کہ ہے
پُرگل خیالِ زحمت سے دامنِ نگاہ کا

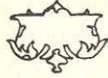
جاں در ہواے یک بگم گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا





جوڑ سے باز آئے، پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
 رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا
 لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
 ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
 موجِ خوں سر سے گز رہی کیوں نہ جاے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
 عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ مر گئے پر، دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
 کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا



لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ بادِ ہبشاری کا
 حریفِ جوشِ دریا نہیں خود داری سہل جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہبشاری کا





عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
تجھ نے قیمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد
دل ہوا کشمکشِ چارہ زحمت میں تمام
اب بھاسے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
ضعف سے گریہ مُبدل بہ دمِ دُہوا
دل سے مٹنا تری نگشتِ حنائی کا خیال
ہے مجھے ابرہہ ساری کا برس کرکھلنا
گر نہیں نکمتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
تاکہ تجھ پر کھلے عجب از ہوائے صقیل
دُرد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تھا لکھا بات کے بنتے ہی بُدا ہو جانا
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
ہو گیا گوشت سے ناخن کا حبِ اہو جانا
روتے روتے عنہمِ فرقت میں فنا ہو جانا
کیوں ہے گردِ روہِ جولاں صبا ہو جانا
دیکھ برسات میں سبز آنے کا ہو جانا

بخشتے ہے جلوۂ گل، ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا



ب

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موج شراب
 دے لپٹے کو دل و دستِ ثنا موج شراب
 پوچھ مت وجہِ سیستِی اربابِ چمن
 سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب
 جو ہوا غرقہ مے سخت رسا رکھتا ہے
 سر سے گزرے پچھی ہے بال ہما موج شراب
 ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
 موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب
 چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
 موج گل، موج شفق، موج صبا، موج شراب
 جس قدر رُوحِ نباتی ہے بگترِ شہ ناز
 دے ہے تسکین بہ دم آب بقا موج شراب
 بسکہ دوڑے ہے رگ تاک میں خوں ہو ہو کر
 شہرِ رنگ سے ہے بال کُشا موج شراب
 موج گل سے چراغاں ہے گزر گاؤں خیال
 ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب
 نشے کے پرے میں ہے محوِ تماشائے ماغ
 لکھ رکھتی ہے سر نشو و نما موج شراب
 ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیتِ فصل
 شرح ہنگامہ ہستی ہے، زہے موسم گل
 شرح ہنگامہ ہستی ہے، زہے موسم گل

ہوش اڑتے ہیں مے، جلوہ گل دیکھ، اسد

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موج شراب





رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے عشقِ خونِ بابہ مشرب
لکھے ہے: ”خداوندِ نعمت سلامت!“

”علی الرِّغمِ دشمنِ شہیدِ وفا ہوں
”مبارک مبارک سلامت سلامت“

نہیں گرسرو برگِ ادراکِ معنی
تماشا ہے نیرنگِ صورتِ سلامت



مُندگیتیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یارِ لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت

نورِ عالم نورِ عالم نورِ عالم نورِ عالم



آہِ خط سے ہوا ہے سرو جو بازارِ دوست دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر کون لاسکتا ہے تابِ جلوہ دیدارِ دوست
خانہ ویراں ساری حیرت تماشا کیجیے صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتارِ دوست
عشق میں بیدارِ رشکِ غیر نے مارا مجھے کشتہ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ مارِ روشن کہ اُس بے درد کا دل شاد ہے دیدنِ پرِ نگوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے میری پریش اُس کے ہجر میں بے تکلفِ دوست جیسے کوئی غمِ خوارِ دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسانی واں تک مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدہ دیدارِ دوست
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعیفِ دماغ سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبرِ دوست
چھپکے چھپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست
مہربانیاں دشمن کی شکایت کیجیے؟ یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست؟

یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے رولیفِ شعر میں غالبِ زبیں تکرارِ دوست



ج

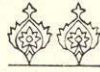
کُٹن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج
قُمری کا طوقِ حلفتِ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارہٴ دل ہر فغاں کے ساتھ
تا نفسِ کجِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل
سیلابِ گریہ در پئے دیوار و در ہے آج



لو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج!





نفس نہ نخبِ من آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمی سخی تلاش دید نہ پوچھ
بہ رنگِ خار مرے آنے سے جوہر کھینچ
تجھے بہانہ راحت ہے انتظارِ دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ ماؤں بستر کھینچ
تری طرف ہے، بہ حسرت، نظارہ نرگس
بہ کورئیِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ
بہ نیمِ سمرقند ادا کر حق و ولایتِ ناز
نیام پر وہِ رخسارِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صباے آتشِ نہاں
بہ روئے سفرہ کبابِ دلِ سمن در کھینچ





خُن غمِ زے کی کشاکش سے چٹھا میرے بعد بارے، آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
منصبِ شیفگی کے کوئی فتاہ نہ رہا ہوئی معذرتِ اندازِ وادامیرے بعد
شمعِ مجبوتی ہے تو اُس میں سے دھواں اٹھتا ہے شعلہٴ عشق سے یہ پوشِ ہوا میرے بعد
خوں ہے دلِ خاک میں احوالِ بُتاں پر، یعنی اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
درِ خورِ عرض نہیں جوہرِ بیدا کو جا نگہِ ناز ہے سرِ مے سے حنا میرے بعد
ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مے مرونِ گنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد
غم سے مڑتا ہوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جاے گا سیلابِ بلا میرے بعد





بلا سے، ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
و فورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
نہیں ہے سایہ، کہ سُن کر نویدِ مستِ دم یار
ہوئی ہے کسِ مستِ درازانی سے جلوہ
جو ہے تجھے سرِ سودا سے انتظار، تو آ
ہجومِ گریہ کا سا مان کب کیا میں نے
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں، تو سائے سے
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے، گھر کی آبادی
نہ پوچھ بے خودی عیشِ مستِ دم سیلاب
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
گئے ہیں چندِ دمِ پیشِ در و دیوار
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
کہ ہیں دکانِ مستِ باغِ نظر در و دیوار
کہ گر پڑے نہ مرے پائو پر در و دیوار
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
کہ ناچتے ہیں پڑے، سر بسر، در و دیوار

نہ کہہ کسی سے، کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار



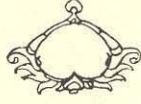


گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سُخن
کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جان میں
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم
چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
مقصد ہے ناز و غمزہ، و لے گفتگو میں کام
برچہ ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بہا ہوں میں تو چاہیے دونا ہوا التفات

جانے گا اب بھی تُو نہ مرا گھر، کہے بغیر
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر؟
لیوے نہ کوئی نامِ ستار کہے بغیر
سر جاے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑے نہ خلق کو مجھے کافر کہے بغیر
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
بنی نہیں ہے بادہ و سار کہے بغیر
سُتا نہیں ہوں بات مکر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تُو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

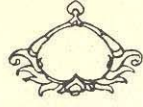




کیوں جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
کیا آبروے عشق جہاں عام ہو جہاں
آتا ہے میرے قتل کو، پر جوش رشک سے
ثابت ہوا ہے گردن میں سنا پہ خونِ غلغ
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
زُتار باندھ، سبجہ صد دانہ توڑ ڈال
ان آبلوں سے پائو کے گھبرا گیا تھا میں
کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مے
گرنی تھی ہم پر برقِ تجلی، نہ طور پر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
سرگرمِ نالہ ہاے شر بار دیکھ کر
رُکتا ہوں، تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
ہم کو حرصِ لذتِ آزار دیکھ کر
لیکن عیا رِ طبعِ حسیدار دیکھ کر
رہرو چلے ہے، راہ کو ہموار دیکھ کر
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر
طوطی کا عکس سمجھ ہے، زنگار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدحِ خوار دیکھ کر

سر مچوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر





لڑتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبِ نیم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدِ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیم دس بے خودی، ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لامِ الف لکھتا تھا دیوارِ دبستان پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں تسلیمِ الفت میں کوئی طومارِ نازِ ایسا
کہ پشتِ چشم سے، جس کے نہ ہو دے مہرِ عنواں پر
مجھے اب، دیکھ کر ابرِ شفقِ آلودہ، یاد آیا
کہ فُرت میں تری، آتشِ برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ نازِ کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑنا صح سے غالب، کیا ہو اگر اُس نے شدت کی؟
ہمارا بھی تو آئندہ زور چلتا ہے گریباں پر!



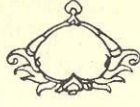


ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
اُبرو سے ہے کیا اُس نگہ ناز کو پیوند ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کہاں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے، جا کر دل جُباں اور
ہر چند سبکدست ہوئے بُت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدہ غنٹا بہ فشاں اور
مَرتا ہوں اِس آواز پہ، ہر چند سر اُڑ جاے جلاؤ کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تابک دھوکا ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین کرتا، جو نہ مَرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دُنیا میں سُخّور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور



صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ رنگِ آخر تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگِ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیرِ وحشت کی ہوا جامِ زُمرود بھی مجھے داغِ پلنگِ آخر



جُئوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عُرانی
گرِیاں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
بہ رنگِ کاغذِ آتشِ زودہ، نیزِ نگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یکِ پیدین پر
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُرودہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرضِ رہن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے شمتِ نگہ کی، چشمِ روزن پر
فنا کو سوئپ، گر مُشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فُورِغِ طالعِ خاشاک ہے موقوفِ گلخن پر
اسدِ سہل ہے کس انداز کا، قابلِ سے کتا ہے
تُو مشقِ ناز کر، خُونِ دو عالم میری گردن پر



ستمِ کشِ مصلحت سے ہوں کہ خوابِ تجھ پہ عاشق ہیں
مُکُلفِ برطرف، مل جائے گا تجھ سا رقیبِ آخر



لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
میٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آتے ہوکل، اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر، جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مَرنا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تُم کون سے تھے ایسے کھرے داد و بند کے! کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گُزری نہ، بہ ہر حال، یہ مدت خوش و ناخوش کرنا تھا جواں مرگ! گُزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جلیتے ہیں غالب

قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور





فارغ مجھے نہ جان کہ مائندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشقِ زینتِ جیبِ کفنِ ہُنوز

ہے نازِ مفلساں زرِ از دستِ رفتِ پر
ہوں سگلِ فروشِ شوخیِ داغِ کفنِ ہُنوز

مے خانہِ حبِ گد میں یہاں خاک بھی نہیں
نمیا زہ کھینچے ہے بُتِ بیدادِ فنِ ہُنوز





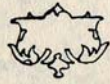
حریفِ مطلبِ مُشکل نہیں فُسونِ نیاز
دُعا قبول ہو یا رب، کہ عمرِ خُضرِ دراز
نہ ہو، بہ ہرزہ، سیاہاں نوردِ وہم و جُود
ہمنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز
وصالِ جلوہ تماشا ہے، پرِ دماغ کہاں
کہ دیجے آئینہٴ تطنّار کو پرداز
ہر ایک ذرّہ عاشق ہے آفتابِ پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز
نہ پوچھ دُستِ مے خانہٴ جُنوںِ غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاکِ انداز





وُسعتِ سخی کرم دیکھ کہ سرتا سرِ حناک
گزرے ہے آبلہ پا ابرگہر بارہنوز

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحہٴ دشت
نقشِ پامیں ہے تب گرمیِ رفتار ہنوز



کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایسا ن عزیز

دل سے نکلا ، پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لاے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز



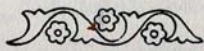
نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
تُو اور آتشِ حنمِ کاکل
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز
لافتِ تم کیں، فریبِ سادہ دلی
ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ور نہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دِن ہو کہ اُسِ ستمگر سے
نہیں دل میں مرے وہ قطرہ خوں
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
جس سے مڑگاں ہوئی نہ ہو گل باز
اے ترا غم، سر بسر انداز
ریزشِ سجدہِ جبینِ نیاز
تُو ہوا جلوہ گر، مُبارک ہو
مُجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تُو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے دروغا! وہ زندہ شاہد باز

س ۵

مُردہ، اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
مگرِ تشنہ آزارِ تسلی نہ ہوا
جُڑے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس
مُنہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
خُب وقت آئے تُم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رُک رُک کے نہ مڑتا، جو زباں کے بدلے
دُشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہو جیسے خوابِ دلِ آزار کے پاس
دیکھ کر بچھ کو، چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گلِ گوشہ دستار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سرِ غالبِ وحشی ہے ہے!
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس



ش

نہ لیوے گر خُس جوہر طراوت سبزِ خط سے
لگا دے خانہ آئینہ میں رُونے نگارِ آتش

فُروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِ مُشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پاس سے، نکالے کہ نہ خارِ آتش

ع

جادۂ رہِ خُور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخِ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع





رُخ نگار سے ہے سوزِ جاودانی شمع
ہوئی ہے آتشِ گُل، آبِ زندگانی شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع
کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ، قصہ تمام
بطرِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانی شمع
غم اُس کو حسرت پر واندہ کا ہے اے شعلہ!
ترے لرزے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع
ترے خیال سے رُوحِ اہتزاز کرتی ہے
جب لہوِ ریزیِ باد و بہ پریشانی شمع
نشاطِ داغِ عنیمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
مُشکفتگی ہے شہیدِ گُلِ خزانِ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مُجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانی شمع



ف ف

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش
مجبور، یاں تک ہوئے اے اختیار حیف

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے نامی نفس شعلہ بار حیف

ت ت

افس کہ دنیا کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخو عفتِ گہرا جھٹ

کافی ہے نشانی تری، چلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بہ وقتِ سفرِ جھٹ

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سُجھن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرفِ پر جھٹ

د ک ۵

زخم پر چھڑکیں کہاں طعن لائے پروا نہ
 گدراہ یار ہے سامان ناز زخم دل
 مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جو
 شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
 داد دیتا ہے مرے زخمِ حُب کی واہ واہ
 چھوڑ کر جانا تنِ محب و حُج عاشقِ حیف ہے
 غیر کی منت نہ کھینچوں گا پے تو نسیر درد
 کیا مزہ ہوتا اگر تپ میں بھی ہوتا نہ
 ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نہ
 نالہ بلبُل کا درد اور خندہ گھل کا نہ
 گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجِ دریا نہ
 یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جانک
 دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نہ
 زخمِ مثلِ خندہ قاتل ہے سرتا پا نہ

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
 زخم سے کرتا تو میں لکوں سے چلتا تھا نہ





اے کو چاہیے اک عُمراثر ہوتے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک
دام ہر موج میں ہے حلفت صد کام نہنگ دکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہ ہوتے تک
عاشقی صبر طلب اور متنا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں غوج بگڑ ہوتے تک
ہم نے مانا کہ تعنِ اُفل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خیر ہوتے تک
پر تو خور سے ہے شبِ نم کو فنا کی تعلیم میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوتے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ بہتی غافل گرمی بزم ہے اک رقصِ شر ہوتے تک

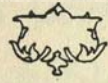
غمِ بہتی کا اسد کس سے ہو جز مرگِ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک



د گ د

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دُعا نہ مانگ
یعنی بغیرِ یکِ دل بے دُعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمارِ یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ



دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی دادِ یاں

ہیں زوالِ آمادہ اجزا آفرینش کے تم
مہرِ گردوں ہے چرخِ رہ گزارِ بادِ یاں



د ل ج

ہے کس قدر ہلاک فریب و فائے گل
 آزاد ہی نسیم مبارک کہ ہر طرف
 جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا
 خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
 ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
 شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
 سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی
 تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
 بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
 ٹوٹے پڑے ہیں حلفتِ دایم ہوائے گل
 اے وائے نالہ لبِ خونیں نوائے گل
 رکھتا ہو مثلِ سایہ گل، سر بہ پائے گل
 میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
 میناے بے شراب و دل بے ہوائے گل
 غول ہے مری نگاہ میں رنگِ اداے گل
 بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
 جس کا خیال ہے گلِ حبیبِ قباے گل



م

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

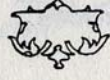
مخپلیں برہم کرے ہے گنجف باز خیال
ہیں ورق گردانی نیزنگ یک بت خانہ ہم

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغ ان شبستان دل پروانہ ہم

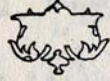
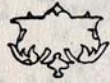
ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترک جستجو
ہیں وبال تکمیر گاہ ہمت مردانہ ہم

دائم اکس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جانتے ہیں سینہ پرخوں کو زنداں خانہ ہم





بہ نالہ حاصل دل بستگی فرم کر
متاع خانہ زنجیر، جزمہ معلوم



مجھ کو دیارِ غم میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کیوں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعویٰ وارتگی کی شرم

ن

لوں و ام بختِ نختہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں





وہ سراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصت کار و بارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سوداے خط و حال کہاں
بھٹی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ عینائی خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقتِ ہجر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا رقصِ خانہٴ عشق
واں جو بادیں، گرہ میں مال کہاں
منکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مُضجِل ہو گئے تو ہی غالب
وہ غنا صمد میں امتِ مال کہاں



کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جھاکتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فُصیح غش سے اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا سچو رقبے کو اہلِ نطنہ قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افکار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے حصارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شررِ دل میں ہے اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا آگِ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ حُدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کیوں شاید
مر گیا غالبِ اشفتہ نوا کہتے ہیں





آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ضُعب سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
کیا کہوں تارِ پکی زندانِ عسَم (اندھیر ہے)
رَوْنقِ ہستی ہے عشقِ حسانہ ویراں ساز سے
زخمِ سلوانے سے مجھ پر چپا رہ جُوئی کا ہے طعن
بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
قطرہِ قطرہ اک ہیوئی ہے نئے ناسور کا
لے گئی ساقی کی نخوت و شرمِ آشامی مری
ہو فشاِ ضُعب میں کیا نا توانی کی نمود
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں
ذرے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
انجن بے شمع ہے، گر برقِ حسدِ من میں نہیں
غیر سمجھا ہے کہ لذتِ جسمِ سوزن میں نہیں
جس وہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
موجِ مے کی آج رگِ مینا کی گردن میں نہیں
قد کے ٹھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربتِ مقرر
بے تکلف ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلشن میں نہیں





عہدے سے مدحِ نازکے، باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشمِ ہائے کشادہ بہ سُوے دل
ہر تارِ زلف کو بنگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تُو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گُماں سے مجھے مُنفعِل نہ چاہ
ہے ہے احسان نہ کردہ، تجھے بیوفا کہوں





مہرباں ہو کے بلا لو مجھے ، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضُعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سہ تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ، ستگر ! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں





ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھڑیں گے رکھ کر عذریستی ایک دن
غزّہ اوج بناے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سارِ ہستی ایک دن
دھول دھپا اُس سہرا پاناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن





ہم پر جہاں سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
ہم کو ستمِ عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
بوسہ نہیں، نہ دیکھیے دشنام ہی سہی
ہر چہند جاں گدازی قہر و عتاب ہے
جاں مُطربِ ترانہ ہل من مزید ہے
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کہہ نہ ہو
نقصان نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرِ نوشت میں
پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
اک چھٹی ہے ورنہ مرادِ امتحان نہیں
پُرسش ہے اور پائے سُخن درمیاں نہیں
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گدہاں نہیں
ق ہر چہند پشت گرمی تاب و توان نہیں
لب پر وہ سنج زمرہ الاماں نہیں
دل میں چھری چھو، مژہ گر خوں چکاں نہیں
ہے عارِ دل نفس اگر آذرِ فشاں نہیں
سو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں
گویا جہیں یہ سجدہ بُت کا نشان نہیں
رُوح القدس اگر چہ مرا ہنر باں نہیں

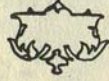
جاں ہے بہاے بوسہ دے کیوں کہ ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نہیم جاں نہیں



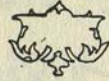
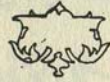


مانعِ دشتِ نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پائو میں، زنجیر نہیں
شوقِ اُس دشت میں دوڑا ہے مجھ کو کہ جہاں
جادو غمیرا از بنگہ دیدہ تصویر نہیں
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادوِ راہِ وفا، مجزومِ شمشیر نہیں
رنجِ نومیدی جاوید! گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سرکھاتا ہے، جہاںِ حرمِ سرا چھا ہو جاے
لذتِ سنگ بہ اندازہِ تفتیر نہیں
جب گرمِ رخصتِ بیاہی و گستاخی دے
کوئی تقصیر، بجزِ خجلتِ تقصیر نہیں
غالبِ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
”آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ مسیہ نہیں“





مست مَرُوک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سُویدالے دلِ چشم میں آہیں



برشکالِ گریہ عاشق ہے ، دیکھا چاہیے
کھل گئی مائندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن
اُفتِ گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی
سرُو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن





عشقِ تاثیر سے نومید نہیں
جالِ سپاریِ شبِ بید نہیں

سلطنتِ دست بہ دست آتی ہے
جامِ مے حنا تم جمشید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پر تو خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رُسا ہو جاے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
عنمِ محمدیِ حبا وید نہیں

کہتے ہیں، جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں



جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

دل آشفٹگاں خال کُنچ دہن کے
سُودا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا! کہ اے محوِ آئینہ داری
تجھ کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سُرائِ قفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شبرِ و کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیسِ غالب
تماشاے اہلِ کرم دیکھتے ہیں



ملتی ہے غم سے نارِ التہاب میں کافروں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
 کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ غراب میں شب بٹے چہر کو بھی رکھوں گہ حساب میں
 تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
 قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
 مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
 جو منکر وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے کیوں بدگماں ہوں دوستِ دشمن کے باب میں
 میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
 میں اور خطِ وصل، خدا ساز بات ہے جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
 ہے تیوری چٹھی ہوئی اندر نقاب کے ہے اک شکن ٹپری ہوئی طرفِ نقاب میں
 لاکھوں لگاؤ، ایک چہرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
 وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
 وہ سحرِ مدعا طلبی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو شراب میں

غالب چھٹی شراب پر آب بھی کبھی کبھی
 پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں



کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں یہ سوءِ ظن ہے ساقی کو ترکے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل، کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع گروہ صدا سمانی ہے چنگ و رباب میں
رو میں ہے رُش عسمر، کہاں دیکھیے تھے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رباب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے جتنا کہ و غم میر سے ہوں تیج و تاب میں
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مثل نمودِ صور پر وجودِ بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و جناب میں
شرم اک ادے ناز ہے، اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
ارائشِ جمال سے فارغ نہیں بہنوز پیشِ نظر ہے آئندہ ائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں بہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبِ ندیم دوست سے آتی ہے بڑے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں





حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پٹیوں جگر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
ہے کیا جو کس کے باندھے میری بلا ڈرے
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
پھر بخود میں بھول گیا راہ کوے یار
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل ہوس کا
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
اے کاش جانتا نہ ترے رگہز کو میں
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
کیا پوچتا ہوں اُس بُت بیدار کو میں
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
سمجھا ہوں دل پذیر ہستیا ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمنہ باز
دیکھوں علی بابا درِ عالی گھر کو میں





ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
وعدہ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق
شاہدِ ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
حسرت، اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تھیں
ظلم کر ظلم، اگر لطفِ دریغ آتا ہو
صاف دردی کشِ سپیانہ جم ہیں ہم لوگ
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں
مژدہ قتلِ مُعتدِر ہے جو مذکور نہیں
لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں
ہم کو قتلِ یثرب کی طرف منظور نہیں
عشق پر عہدہ کی گوں تین رنجور نہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
تو تغافل میں کسی رنگ سے محذور نہیں
واسے وہ بادہ کہ افسردہ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں





نالہ، جُز حُسنِ طلبِ اے ستمِ ایجاد، نہیں
عشق و مُردوریِ عشرت کہ خُسر و کیا خوب
کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ پُوسعت معلوم
اہلِ بنیش کو ہے طوفانِ حوادثِ مکتب
و اے محرومیِ تسلیم و بدا حال و فنا
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
سبِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
نَفی سے کرتی ہے اثباتِ تراوش گویا
کم نہیں جلوہ گری میں تے کوچے سے بہشت
ہے تقاضاے جفا، شکوہ بیداد نہیں
ہم کو تسلیم نہو نامی و نہاد نہیں
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھرایا نہیں
لطمہ موجِ کم از سیلیِ استاد نہیں
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
گر چراغِ ان سِرِ رگِ زریہ باد نہیں
مُردہ! اے مرغ، کہ گلزار میں صیاد نہیں
دی ہے جائے دہن اُس کو، دمِ ایجاد، نہیں
یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس مُنہ سے ہو غُربت کی شکایتِ غالب
تم کو بے مہر می یارانِ وطن یاد نہیں؟





دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

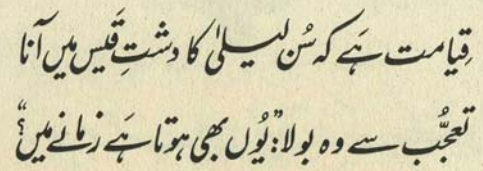
تھک تھک کے ہر مقام پہ دوچار رہ گئے
تیرا پستانہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو عنہم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں



ہو گئی ہے غمیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں





دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اُس کا فکر کو اُلفت آزمانے میں





یہ ہم جو بحر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے جہنم جگہ کو دیکھتے ہیں

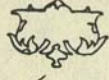
ترے جواہر طرب کلمہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالعِ لعل و گنہ کو دیکھتے ہیں





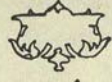
نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ سِراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے
بلا سے، آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے اُن کے تو مرجبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں!
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گداے کو چمے حسانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی ہم، ہمیں کیا کام!
دیا ہے ہم کو حُسنِ دانے وہ دل کہ شاد نہیں
تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کہی کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں



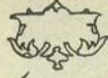


تیرے تُو سن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مُقابل اے عُمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں
نشہ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہاے مضامینِ مست پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی دامانگیاں!
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوابِ غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں





دامِ پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرانہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارِ زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حدِ چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آفر گستاہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زُمرُود و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدمِ مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالبِ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں



سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزمِ آسیاں
تھیں بنا تے لہجہ گر دُوں دن کو پڑے ہیں نہاں
قید میں یعقوب نے لی، گو، نہ یوسف کی خبر
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زبانِ برص
جُڑے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
ان پر زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
نہیں اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
میں چمن میں کیا گیا، گویا دُستار کھل گیا
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
بسکہ روکائیں نے اور سینے میں اُبھریں پے پے
واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام اُگیا
ہم مُوحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رُوم
رنج سے خُور ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہِ کنعاں ہو گئیں
میں سمجھوں گا کہ شمعیں دُستِ فزاں ہو گئیں
قدرتِ حق سے یہی عویریں اگر واں ہو گئیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
بُلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
جو مری کوتاہی قسمت سے مڑگاں ہو گئیں
میری آہیں بخیر چاکِ گریباں ہو گئیں
یاد تھیں جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہو گئیں
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں
ملتیں جب مٹ گئیں اجڑے ایماں ہو گئیں
مُشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تُم کہ ویراں ہو گئیں



دیوانگی سے دوش پہ زُتار بھی نہیں یعنی، ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نسیا زِ حسرت دیدار کر چکے دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں
بے عشق عُمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں طاقت بہ قدر لذت آزار بھی نہیں
شورِ یدِ گی کے ہاتھ سے ہے سروِ بالِ دوش صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
گنجائشِ عداوتِ غمیاں یک طرف یاں دل میں ضعف سے ہوں یار بھی نہیں
ڈرنا لہ ہاے زار سے میرے، خدا کو مان آخر نواے مرغِ گرفتار بھی نہیں
دل میں ہے یار کی صفِ شِکاں سے کُشتی حالانکہ طاقتِ خلشِ حنا بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اس کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں



نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخوردے تن میں
ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی
و دلایت خانہ بیدار کاوش لے کر گاہ ہوں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شہتال کی
نیکو ہش مانع بے ربطی شور جنوں آتی
ہوئے اُس مہر و شش کے جلوہ تماشا کے آگے
نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
ہزاروں دل دیے جوش جنوں عشق نے مجھ کو

ہوا ہے تارِ اشک یاس رشتہ چشم سوزن میں
کفِ سیلاب باقی ہے بہ رنگِ پنبہ روزن میں
بگین نام شاہ ہے، مرا ہر قطرہ خوں تن میں
شب مہ ہو، جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کھوڑن میں
ہوا ہے خندہ احباب بخیہ حبیب و دامن میں
پر افشاں جو ہر آئینے میں مہشل ذرہ روزن میں
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جوش ہوں تو ہوں گلشن میں
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

اس زندانی تاثیر الفت لے خواب ہوں
نہم دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں





مرے جہان کے، اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے غمِ حُب، سو جگر میں خاک نہیں
مگر، غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگر نہ تاب و تُوں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشتِ شمال کی آمد آمد ہے
کہ غیبِ جلوہ گلِ رگِ زریں میں خاک نہیں
بھلا اُسے نہ سہی کچھ مچھی کو حرمِ آتا
اثرِ مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوہ گل سے خراب ہیں میکیش
شرابِ خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تمسکِ گھر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے آسہ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنس میں خاک نہیں





دل ہی تو ہے نہ ننگ و خشت درد سے بھرنے آئے کیوں
دیر نہیں جسم نہیں، در نہیں، آستان نہیں
جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہر نیم روز
دشنہ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
حسن اور اُس پہ چُسن ظن رہ گئی بُوالہوس کی شرم
واں وہ غرورِ عِز و ناز، یاں یہ حجابِ پاس وضع
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
رو میں گے ہم زار بار، کوئی نہیں ستائے کیوں
بیٹھے ہیں رگِ زار پہ غمِ غمیر ہمیں اُٹھائے کیوں
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ مچھاپے کیوں
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
اپنے پر استیاد ہے غمیر کو آزمائے کیوں
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ ملے کیوں
جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جاے کیوں

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند رہیں
رو تھے زار زار کیا، کیجیے ٹائے ٹائے کیوں





غُنجِ ناستِ کُفّتہ کو دُور سے مت دکھا، کہ 'یوں' بوسے کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا، کہ 'یوں'!
پُرسش طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کے اُس کے ہر اک اشارے سے بچلے ہے یہ ادا، کہ 'یوں'!
رات کے وقت مے پیے ساتھ قریب کو لیے آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ 'یوں'!
غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا تو دیکھیے سامنے آن مٹھینا اور یہ دکھنا کہ 'یوں'!
بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے اُس کی تو خاموشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ 'یوں'!
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے ہتی سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ 'یوں'!
مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح دیکھ کے میری بخودی چلنے لگی ہوا کہ 'یوں'!
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی آئندہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پاک کہ 'یوں'!
گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال موج، محیطِ آب میں مائے سہے دستِ پاک کہ 'یوں'!

جو یہ کہے کہ رنجیتہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گُفّتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ 'یوں'!





حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بہ قدر حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشہ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سرو قد، گرم حسدِ ام ناز آجاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری، نالہ فرسا ہو





کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبتِ اہل کُشت کو؟
طاعت میں تا، رہے نہ مے و انگبین کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں مُنحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹپڑھا لگا ہے قِطْمِ سرِ نُشت کو
غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کُشت کو





وَارِستہ اس سے ہیں کہ مَحَبَّت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضَعْف نے رنگِ خستِ لاط کا
ہے مجھ کو شجھ سے تذکرہ غیہ کا گلہ
پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
ڈالا نہ بکیسی نے کسی سے مُعاملہ
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہنگامہ زبونی بہمت ہے انفعال
وارستگی بہانہ بیگانگی نہیں
مُلتا ہے فُوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو
ہے دل پہ بارِ نقشبِ مَحَبَّت ہی کیوں نہ ہو
ہر چہد بر بسیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
یوں ہو تو چارہ عَنِمُ الْفِت ہی کیوں نہ ہو
اپنے سے کھینچتا ہوں، حُجالت ہی کیوں نہ ہو
ہم نچن سجتے ہیں، حُسلوت ہی کیوں نہ ہو
حاصل نہ کیجے دہر سے، عِجرت ہی کیوں نہ ہو
اپنے سے کر، نہ غیہ سے، دُشت ہی کیوں نہ ہو
عمرِ عزیزِ صُرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو





قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میسے شیون کو
نہیں گر ہمدی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس چراغت پر
خدا شرماے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
ابھی ہم قسمل کہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سوار ابر آئے
وفا داری بشرط استواری، اصل ایماں ہے
شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ جو مجھ کو
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
سُخن کیا کہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جو اہر کے؟
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجان گلشن کو
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو
کیا سینے میں جس نے خوچکاں مرگان سوزن کو
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
نہیں دیکھا شنادر جوئے غل میں تیسے ٹوسن کو
کیا بے تاب کاں میں جھنپش جو ہرنے آہن کو
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرم کو
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گارو پر ہم کو
جہاں تلوار کو دیکھا، مجھ کا دیت تھا گردن کو
رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں ہزن کو
جگہ کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟

مرے شاہِ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب

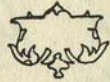
فریدون و جہم و گیشسرو و داراب و بہمن کو





دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پائو
دہی سادگی سے جان، پڑوں کو بہن کے پائو
بھاگے تھے ہم بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
الند رے ذوقِ دشت نوردی، کہ بعدِ مرگ
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
رکھتا ہے ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پائو
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرِ زن کے پائو
ہو کر اسیرِ دابتے ہیں اُسن کے پائو
تن سے سوا فکار ہیں اس خستہ تن کے پائو
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پائو
اُڑتے ہوئے، اُجھتے ہیں مرغِ چمن کے پائو
دکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پائو

غالب! مرے کلام میں کیونکر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھوکے خُسر و شیریں سخن کے پائو



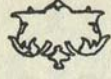
واں اُس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی، یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تا کہ دیدہِ پنچیس سے نہ ہو



واں پہنچ کر جو غش آتا ہے ہم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محو و فار کھتا ہے
ضعف سے نقش پے مور ہے طوق گردن
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو
ریشک ہم طرحی و درد اثرِ بانگِ حزین
سر اڑانے کے جو وعدے کو مکر چاہا
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ، ولیکن ناچار
تُم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
لکھنو آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی
مقطعِ سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر
صدرہ آہنگِ زمیں بوس قدم ہے ہم کو
کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
نالہ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
ہوئیں سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
غرم سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توفیقِ غالب
جادہ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو





تُم جانو، تُم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
منجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مَوَاحِذَہ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تُم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ گش و سق ناشناس ہیں
انا کہ تُم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو
اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب مسیکدہ چھٹا تو پھراب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سُننتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب دُرست
لیکن خدا کرے وہ تیرا جلوہ گاہ ہو
غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دُنیا ہو یا رب اور میرا بادشاہ ہو
دل دل دل دل دل دل دل دل دل دل دل



گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نامِصال
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
ٹھہریں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
اُجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
ہمیں پھر اُن سے اُمید اور اُنہیں ہماری قدر
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تلی کا
بتاؤ، اُس مڑہ کو دیکھ کر، کہ مجھ کو قرار
کے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیونکر ہو؟
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
حیا ہے اور یہی گوگو تو کیونکر ہو
بُتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دُ تو کیونکر ہو
وہ شخص دن نہ کے رات کو تو کیونکر ہو
ہماری بات ہی پوچھیں نہ دو تو کیونکر ہو
نہ مانے دیدہ دیدار جو تو کیونکر ہو
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جُنوں نہیں غالب ولے بہ قولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو





کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اس محبت کو
وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا مٹھرا
قفس میں مجھ سے رُوداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
یہ کہہ سکتے ہو، ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دکھیو جرم کس کا ہے؟
یہ فتنہ آدمی کی حسنا نہ ویرانی کو کیا کم ہے
یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے رطنے میں رُسوائی
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ نہ باں کیوں ہو
سبک سرب کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
تو پھر، اے سنگدل، تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
گر می ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشتیاں کیوں ہو
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کیوں کہ باں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہر باں کیوں ہو

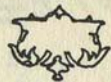


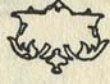


رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سُخُن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار
اور اگر مَر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

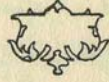


از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت مُقابل ہے آئینہ





ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دُشوار ہی رہ و ستم ہمارا نہ پوچھ



گھر میں تھا کیا، کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیرِ سوئے





مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے بھول پاس آنکھ، قبلہ حاجات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں مہِ رُخوں کے لیے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں حبِ احبِ ا ہر رنگ میں ہمار کا اثبات چاہیے
سرپائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی ق رُوسوے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانہ صفات عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیے

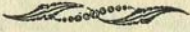
نشو و نما ہے اصل سے غالبِ فُروع کو

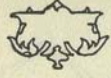
خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے



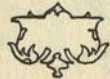
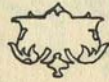


بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سورہتا ہے بہ اندازِ چکبندِ سرنگوں وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزرده ہم چپے تکلف سے
تکلفِ برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکینِ دل آزرده کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دروِ دروں وہ بھی
نہ اتنا بڑبڑ تینج جہنِ پر ناز و فداؤ
مرے دریاے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
مے عشرت کی خواہشِ ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالبِ شوقِ وصل و شکوہِ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

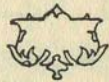




ہے بزمِ بُبتاں میں سُخنِ آزر وہ لبوں سے
 تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے
 ہے دورِ تَدَح و جبرِ پریشانی صہبا
 یک بار لگا دو خُجْمِ مے میرے لبوں سے
 زندانِ درِ مَسِکدہ گستاخ ہیں زاہد
 زہنہار نہ ہونا طرفِ ان بے ادبوں سے
 بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آئینہ
 ہر چہ مری جان کو تھا رُبط لبوں سے

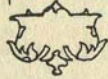


تا، ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا سُن لیتے ہیں، گو ذکرِ ہمارا نہیں کرتے
 غالبِ ترا احوال سُنادیں گے ہم اُن کو وہ سُن کے بُلالیں، یہ اجارا نہیں کرتے





غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا، یارب!
قسم کھائی ہے اُس کا فِر نے کاغذ کے جلائے کی
لپٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
وَلَمْ يَشْكُلْ ہے حکمتِ دل میں سوزِ غم چھپانے کی
اُنہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا طالعِ مگر تمہید جانے کی
لکھ کو پِ حوادث کا تجلّ کر نہیں سکتی
میری طاقت کہ ضامن تھی تبتوں کے ناز اُٹھانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ اُنائے زماں غالب
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہائیک





کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بضیۂ مَورِ آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پر تو سے آفتاب کے، درے میں جان ہے
حالانکہ ہے یہ سیلیٰ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پرے کا گمان ہے
کی اُس نے گرم، سینہ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب، تم نے غیر کو بوس نہیں دیا؟
بس چپ رہو ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوارِ یار میں
فرماں رواے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی عنہم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے
ہے بارے استمادِ وفاداری اس قدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے





درو سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ٹائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
عمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
زہر لگتی ہے مجھے آبِ دہوائے زندگی
گلِ فنا نہاے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبتِ دل گئی
ہاتھ ہی تیغِ آزما کا کام سے جاتا رہا
کس طرح کاٹے کوئی شبِ ہائے تارِ شبِ کال
گوشِ مجبورِ پیامِ وحشتمِ مرمِ جمال

کیا ہوئی ظالم تری غفلتِ شعاری ٹائے
تُو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ٹائے
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ٹائے
عمر کو بھی تو نہیں ہے پانداری ٹائے
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ٹائے
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ٹائے
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ٹائے
اٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ٹائے
دل پہ اک گلنے نہ پایا زخمِ کاری ٹائے
ہے نظرِ شوکر وہ خستِ شمارِ یاری ٹائے
ایک دل، تِس پر یہ نا اُمیدواری ٹائے

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب! ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ٹائے





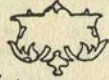
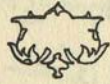
سُگرشِ تکی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
یکجہ بیاں سُورِ تپِ عنہم کہاں تک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ رساں ہے
ہے وہ عُنُورِ حُسن سے بیگانہ و نا
ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پنی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر اک مکان کو ہے یکیں سے شرفِ اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ اُداس ہے





گر خاموشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
 کس کو سناؤں حسرتِ اطہار کا گِلہ دل فردِ جمع و خرّج زبانتے لال ہے
 کس پردے میں ہے آئینہ پرواز اے خدا رحمت کہ عذرِ خواہ لب بے سوال ہے
 ہے ہے! خدا نخواستہ وہ اور دشمنی اے شوقِ مُنْفَعِل! یہ تجھے کیا خیال ہے
 مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
 وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ تھا دریا زمین کو عرقِ نفعِ مال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
 عالمِ تمام حلقہٴ دامِ خیال ہے



جھل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزوِ نہ اُمی دل جو شکرِ گریہ میں ہے دُوبنی ہوئی اسامی
 اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ نامتامی



تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو میرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

ولا یہ درد و الم بھی تو مُقْتَنَم ہے کہ آج نہ
نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

مَدَنی مَدَنی مَدَنی مَدَنی مَدَنی مَدَنی

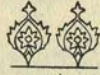


پینس میں گزرتے ہیں جو کچھ سے وہ میرے
کندھا بھی کماروں کو بدلنے نہیں دیتے

مَدَنی مَدَنی مَدَنی مَدَنی مَدَنی مَدَنی



ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا
ظاہراً کاغذ ترے خط کا، عنطِ بردار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی نائمی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند آتشبار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی در ماندگی میں نالے سے ناچار ہے
ہے وہی بدستی ہرزہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسمان سرشار ہے
مجھ سے مت کہ: ”تُو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی“
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا
بجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے



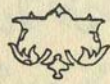


مری ہستی فضا نے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا غمنا ہے
خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتمِ بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے افسانہ، ورنہ اے ہمد
اثرِ نر یاوِ دل مائے خریں کا کس نے دیکھا ہے
نہ لائی شوخی اندیشہ تاب رنجِ نو میدی
کفِ افسوس لانا عہدِ تبدیلیہ تمنا ہے





رحمِ کرمِ عالم کہ کیا بُودِ چراغِ کُشتہ ہے
نبضِ پیما رِ وفا دُودِ چراغِ کُشتہ ہے
دلِ لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سُدِ چراغِ کُشتہ ہے



چشمِ خوابِ خاموشی میں بھی نوا پرداز ہے
سُرمہ، تُو کھوے کہ، دُودِ شعلہ آواز ہے
پیکرِ عشاقِ سارِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے
دستِ گاہِ دیدہ خنجرِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباںِ حبلوہ گُل، فرشِ پانداڑ ہے





عشق مجھ کو نہیں ، وحشت ہی سہی میری وحشت ، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی اے! وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو ، جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک و فنا کرتے ہیں؟ نہ سہی عشق ، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف آہ و فساد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی نحو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جاے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی





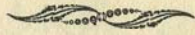
ہے آرمیدگی میں نکویش بجا مجھ
صُبحِ وطن ہے خندہ دنداں نما مجھ

دھونڈے ہے اُس سُنعنی پتیشِ نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھ

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادی خیال
تا، باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھ

کرتا ہے بسکہ باغ میں تُو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نہکتِ گل سے حیا مجھ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسا کیا مجھ



زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!





اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہو اکیے
دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا میں اور جاؤں دے سے ترے بن صدا کیے؟
رکتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے!
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم تو نے وہ گنج ہائے گرائمسا یہ کیا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
صُحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے





زَفَارِ عُمَرُ قَطَعِ رَهْ اِضْطِرَابِ هَے
اِس سالِ کِے حسابِ کو برقِ آفتابِ هَے
مِیائے مَے هَے سِر وِ شاطِ بهارِ مَے
بالِ تَدْرُو جِسلوَه موجِ شرابِ هَے
زخمی هُو اِ هَے پاشَنه پائے ثباتِ کا
نَے بھاگنے کی گونِ اقامتِ کی تابِ هَے
جادادِ بادِ نوشی رِنداں هَے ششِ بهتِ
غافلِ گماں کرے هَے کہ گیتی خرابِ هَے
نظّارِ هَے کیا حریفِ هُو اُس برقِ حُسنِ کا
جوشِ بهارِ جلوے کو جسِ کِے نقابِ هَے
میں، نامُرادِ دلِ کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخِ سے نگہِ کامیابِ هَے

گُزرا اِس دَستِ پِعی نامِ یارِ سے
قاصدِ پہ مَچھ کو رشکِ سوالِ و جوابِ هَے





دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دور چشم بد تری بزم طرب سے، واہ واہ
گرچہ ہے طرزِ تغافل پر وہ دارِ رازِ عشق
اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دل رنجور، یاں
ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
نقش کو اُس کے مہصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
آگینہ سُندی صہب سے پگھلا جائے ہے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گہرا جائے ہے
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے
پر ہم ایسے کھوے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
مثل نقشِ مدعائے غمیر بیٹھا جائے ہے
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھینچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے!





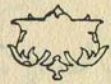
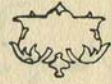
گرم منہ یاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب امان ہجر میں دی برویلیالی نے مجھے
نُسیہ و نَفْسِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے ، مری ہمتِ عالی نے مجھے

کثرتِ آرائی وحدت ہے پرستاری و ہم
کر دیا کافر ان اَصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گھل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پرواہی نے مجھے





کارگاہِ ہستی میں لالہ داغِ سماں ہے
برقِ خرمینِ راحتِ خونِ گرمِ دہقاں ہے
غُنجِ تاشِ گُفتنِ ہاِ برگِ عافیتِ معلوم
باوجودِ دلِ جمعیِ خوابِ گلِ پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بیابانی کس طرح اُٹھایا جاے
داغِ پشتِ دستِ عجزِ شعلہ خُشِ بنداں ہے



اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہِ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے





سادگی پر اُس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تفسیر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس ہجومِ نا اُمیدی، خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سُنّی بے حاصل میں ہے
رنج رہ کیوں کھینچے، واما ندگی کو عشق ہے!
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم، منزل میں ہے!
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی!
فتنہ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدہ غالبِ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے



دل سے تری نگاہِ حبِ گریہ اُتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
شوق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراغ تکلیفِ پردہ دارِ زخمِ حبِ گریہ
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اُٹھے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اُڑتی پھرے ہے خاکِ مری کوئے یار میں بارے اب اے ہوا! ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دینریبی اندازِ نقشِ پا موجِ حرامِ یار بھی کیا کھل کر گئی
ہر بُو الوَس نے حُسنِ پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ نطنز گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
فردا وِی کا تفریقہ یک بار مٹ گیا کل تم گئے کہ ہم پر قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ حناں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھ گئی





تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
خُورانِ حُسد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفنِ بعدِ قتل
میرے پتے سے خُلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج ، ورنہ ہم
ہر شبِ پیا ہی کرتے ہیں مے ، جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کیو اگر نامہ بر ملے
تُم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فُرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خُضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کُوچہ دلدار ! دیکھنا
تُم کو کہیں جو غالبِ آشفۃ سر ملے



کوئی دِن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کی، سرگرائی اور ہے
دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکشرِ نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالبِ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے





کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن مُعین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نطنہ نہیں آتا بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس مُنہ سے جاؤ گے غالب
شرمِ تُم کو مگر نہیں آتی





دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الہی یہ ماحبہ کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکین زلفِ عنبریں کیوں ہے بگڑ چٹم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و شگل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں مہبلا کر ترا مہبلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے
جانِ تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب

مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے





کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالبہ مو آئے
ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نیکیرین
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہاں اہل طلب! کون سُنے طعنہ نایافت
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
کی ہمنفسوں نے اثرِ گریہ میں تقیر
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے
کچھ کہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
ہاں مُنہ سے مگر بادہ دوشینہ کی بو آئے
ہم سمجھ جئے ہیں اُسے جس بھلیں میں جو آئے
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے
اُس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے





پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے سینہ جو یاسے جنمِ کاری ہے
پھر بگر کھودنے لگا ناخن آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز پھر وہی پردہٴ عمارتی ہے
چشمِ دلّالِ جنسِ رُسوائی دلِ حنیدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگِ نالہ فرسائی وہی صد گونہ اشکباری ہے
دلِ ہوائے حنہامِ ناز سے پھر محشرِ ستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارہٴ بگر نے سوال ایک مندیاد و آہ وزاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشقِ طلب اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مُفتِ دم تھا آج پھر اُس کی رُوبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے



جُنوں تھمت کش تکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
نمک پاش خراشِ دل ہے لذتِ زندگانی کی
کشاکش ہائے مہتی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصتِ روانی کی
پس از مُردن بھی دیوانہ زیارتِ گاہِ طفلان ہے
شرارِ رنگ نے تربتِ پیرِ میری، گلِ فِشانی کی



خمشوں میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہِ دل سے تری سُرمدہ سنا نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم صبا جو غنچے کے پردے میں جانا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینہ عاشق سے آپ تیغِ نگاہ کہ زحیمِ روزِ در سے ہونا نکلتی ہے





نکو ہمیش ہے سزا فریادی بیدارِ دلبر کی
مبادا خندہ دندانُ مَسا ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوںِ ریشگی بخشے
اگر بوے بجائے دانہ دہقانِ نوکِ نشتر کی

پر پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانیِ دورِ ساغر کی

کروں بیدارِ ذوقِ پرفشانیِ عرض، کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی، اڑنے سے پہلے میرے شہر کی

کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے!
میری قیمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوارِ پتھر کی؟





بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
پہناں تھا دام سخت قریب آشیان کے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر؟
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
اللہ سے تیری تندی خو، جس کے بیم سے
اہل ہوس کی فتح ہے ترکِ نبرد عشق
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کچھ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیرے سوا بھی ہم یہ بہت سے ستم ہوئے
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اجزلے نالہ دل میں مرے رزق ہم ہوئے
جو پائو اٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے
جو واں نہ کچھ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے





جو نہ نفتِ داغِ دل کی کرے شعلہٴ پاسبانی
تو فُردگی نہاں ہے بہ کَمِینِ بے زبانی

مجھے اُس سے کیا توقُّع بہ زمانہٴ جوانی
کبھی کو دُکِی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

یُونہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عُدو کو یارب سے میری زندگانی





ظلمتِ کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
نے مُردہ وصال نہ نظارہ جمال
مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
گوہر کو عفتِ گردنِ خواباں میں دیکھنا
دیدارِ بادہ ، حوصلہ ساقی ، نگاہِ مست
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
دیکھو مجھے ، جو دیدہِ عبرتِ نگاہ ہو
ساقی بہ جلوہ شمعِ ایمان و آگہی
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یا صبحِ دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع ہے دلیلِ سحرِ سوخوش ہے
مُدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
اے شوقِ یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
کیا اوج پر ستارہ کو ہر فروش ہے
بزمِ خیالِ میکدہ بے فروش ہے
ق زہار اگر تمھیں ہوسِ نالے و نوش ہے
میری سُنو ، جو گوشِ نصیحتِ نیوش ہے
مُطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
دامانِ باغبان و کھلِ گل فروش ہے
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
نے وہ سُور و سوز نہ جوش و خروش ہے
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

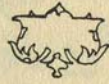
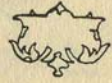
آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریح نامہ نوائے سُروش ہے



آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدارِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازہٴ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عجبؔ ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی خُبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ٹائے معانی
غیرِ گلِ آئینہٴ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے
ولے اگر عہدِ استوار نہیں ہے
تُو نے قسمِ میکشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے



ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نطنبر میں فرق مشکل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذتِ زخمِ سوزن کی
سمجھو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گل جس گُلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچہ گل کا صدائے خندہ دل ہے



پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پائیں جو ہر آئینہ زانو مجھے
دیکھنا حالتِ مرے دل کی، ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھڑے تو مجھے





جس بزم میں تُو ناز سے گفتار میں آوے جاں کا لبِ صورتِ دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر تُو اس قدر دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مایگی اشکِ بجا ہے جب نختِ جگر دیدہ خُونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے
اُس چشمِ فُٹوں گر کا اگر پائے اشارہ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سُکھ گئی پیاس سے یارب اک آبلہ پا وادی پر حنار میں آوے
مَر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب ہُو تنِ نازک آغوشِ خمِ حلفتِ زَنار میں آوے
غارتِ گرِ ناموس نہ ہو گر ہو س زر کیوں شاہِ گلِ باغ سے بازار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ نالاں! جب اک نفسُ اُجھا ہوا ہر تار میں آوے
آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے اے وائے، اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینہ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے





حُسنِ مہ گرچہ بہ بنِ کامِ کمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر خطہ نگاہ
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
بے طلب دیں تو مزہ اُس میں سوا ملتا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
دیکھیے پاتے ہیں عشاق مہوں سے کیا فیض
ہم سخنِ تیشے نے نہ باد کو شیریں سے کیا
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سر سبز
اُس سے میرا مہِ نور شیدِ جمال اچھا ہے
جی میں کہتے ہیں کہ مُفت آئے مال اچھا ہے
ساغرِ حُجْم سے مرا جامِ مصال اچھا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو غوے سوال اچھا ہے
وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ارکا حال اچھا ہے
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مال اچھا ہے
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے





عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سارے سے، سرپائو سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت
فقط خراب لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
غم زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
خدا کے واسطے دادِ اس جُنُونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ برسے ہم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھاتی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو لے طرہ ہاے خم بہ خم آگے
دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجدِ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے
قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے





شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے یہ بھی مست کہ، کہ جو کیسے تو گلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا اک ذرا چھڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو شکوہ جو ر سے سرگرم جفا ہوتا ہے
عشق کی راہ میں ہے چرخِ ٹکوکب کی وہ چال سُست روجیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہر ناوکِ بیداد، کہ ہم آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے
خامہ میرا کہ وہ ہے بارِ بُد، زرمِ سُخنِ ق شاہ کی مدح میں یوں غم نہ سرا ہوتا ہے
اے شہنشاہ کو اکب سپہ و ہر علم تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
ساتِ تسلیم کا حاصل جو نہ اہم کیجے تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بُد سے ہوتا ہے ہلال آستان پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
میں جو ستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں یہ بھی تیرا ہی کرم ذوقِ منزا ہوتا ہے

رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں مُعاف

آج کچھ دردِ مرے دل میں سوا ہوتا ہے



ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ آدا
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دوچار
رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ شند ہو کیا ہے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے
ہمارے جیب کو اب حاجتِ فو کیا ہے
کریڈتے ہو جوابِ راکھِ جستجو کیا ہے
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
سوائے بادۂ کلفِ نامِ شکو کیا ہے
یہ شیشہ و قدح و گوزہ و سبکو کیا ہے
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مُصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے





میں اُنہیں چھڑوں، اور کُچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو، جو کُچھ ہو
کاشکے تُم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

آہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیسے ہوتے





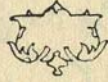
غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ ، کہ یہ
ہتکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمرم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامہ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غُسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حسام کے
عشق نے غالب نبھا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے





پھر اس انداز سے بہا آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشا
دیکھو اے ساکنانِ خطِ خاک اس کو کہتے ہیں عالمِ آرائی
کہ زمین ہو گئی ہے سرتاسر رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا رُوے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے چشمِ نرگس کو دی ہے بنیائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادِ پیمائی

کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی



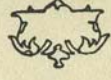


کب وہ سُنتا ہے کہانی میسری اور پھر وہ بھی زبانی میسری
خلشِ غمزہ خُزیر نہ پوچھ دیکھ ٹخنہ بہ نشانی میسری
کیا بیاں کر کے مرا رویں گے یار مگر آشفستہ بیانی میسری
ہوں زِ خود رفتہ بیدارے خیال بھول جانا ہے نشانی میسری
مُتقابل ہے مُقابل میسری رُک گیا دیکھ روانی میسری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میسری
گردِ بادِ رہِ بیتابی ہوں صرصرِ شوق ہے بانی میسری
دُہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی ہیچ مدانی میسری

کر دیا ضُعت نے عاجزِ غالب

ننگِ پیری ہے جوانی میسری

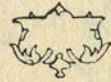
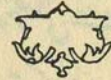




نقشِ نازِ بُتِ طراز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤسِ پئے خامۂ مانی مانگے

تُو وہ بدخو کہ تَحسُّسِ کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفستہ بیانی مانگے

وہ تب عشق، تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ حبِ گہرِ ریشہ دوانی مانگے



تغافلِ دوستِ ہوں، میرا دماغِ عجزِ عالی ہے
اگر سپہِ موتی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

رہا آبادِ عالمِ اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جامِ و سُبُو میخانہ خالی ہے



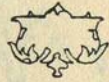
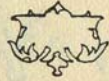


جس زحمت کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عُدو کی
اچھا ہے سرِ انجستِ جنائی کا تصوّر
دل میں نظر آتی تو ہے اک بُوند لُہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے وصلگی سے
یاں تو کوئی سُنتا نہیں منیرِ یادِ کسو کی
دشمن نے کبھی مُنہ نہ لگایا ہو بگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صدحیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بُتِ عریہ جو کی





سیابِ پشتِ گرمی آئینہ دے ہے، ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بیستہ دار کے
آغوشِ گلِ گشودہ برائے وداع ہے
اے غنڈلیب چل، کہ چلے دن بہار کے



ہے وصلِ حجبِ عالمِ تمکین و ضبطِ میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں
شوقِ فضول و جراتِ زندانہ چاہیے





چاہیے اچھوں کو ، جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
صحبّتِ رنداں سے واجب ہے حذر جاے مے ، اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب ، بے ایام گل کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری ، کھویا غم کو کس قدر دشمن ہے ، دیکھا چاہیے
اپنی ، رُسوائی میں کیا چلتی ہے سعی یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
مُختصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے
غافل ، ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں غُبرِ ویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے





ہر قدمِ دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے، بھاگے ہے بیاں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافلِ خوشتر ہے نگہِ رشتہ شیرازہِ مَرگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
غمِ عشاق نہ ہو سادگیِ آموزِ بُستاں کس قدر خانہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے!
اثرِ آبلہ سے حبادِ صحرا لے جنوں صورتِ رشتہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بیخودی! بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو! پڑے سائے کی طرح میرا شہستان مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے ہونگہ مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے
بکیسی ہاے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے! سایہِ خورشیدِ قیامت میں ہے نہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صدِ جلدِ رنگیں تجھ سے آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے





مُتھکتے چپیں ہے، غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبہِ دل
کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جاے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
پردہ چھوڑا ہے اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
بوجھو وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتشِ غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے





چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے
صُبح کے مَنس زخمِ دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
ویدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دلِ نوید، یارب کب تک
آجیگنہ کوہ پر عرضِ گرِ ثبانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
مُوے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زُلف کو اُلفت نے عہد
یک و تلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے





وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
وے مجھے پیشِ دل محالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل، لگاؤٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جُنیشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو مُنہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی! جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

اسدِ خوشی سے مرے ہاتھ پائو پھول گئے
کہا جو اُس نے: ”ذرا میرے پائو داب تو دے“



خطر ہے رشتہ الفتِ رگ گردن ہو جاوے
غرورِ دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہو جاوے
سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما غالب
اگر گل سرو کے قامت پر پیراہن نہ ہو جاوے

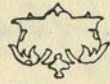
گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آتی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا آغوشِ کشائی ہے
واں گنگرِ استغنا ہر دم ہے بکندی پر
یاں نالے کو اور اُلٹا دعوے رسائی ہے
از بسکہ بکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغِ نطنز آیا اک چشمِ نمائی ہے



فساد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پاسبان نے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغبان تُو نے
گر باغ گلے مے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مست فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
کیوں رد و شرح کرے ہے زہد!
مے ہے یہ گس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تُو کیا ہے، اے "نہیں ہے"!



نہ پوچھ سُحْنۂ مَرہَمِ جِراحِ دِل کا
کہ اُس میں ریزۂ الماسِ جُزْوَ عَظْم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک بنگم کہ بہ ظاہر نگاہ سے کم ہے

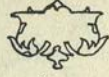


ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

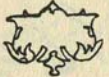
در پردہ اُنہیں غیر سے ہے ربطِ نہسانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نو مِی دمی اربابِ ہوس ہے
غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے!





کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے
کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے، مگر نہ سُنے نالہ ہائے بلبِ زار
کہ گوشِ گلِ نیمِ شبِ نیم سے پنبہ آگیاں ہے
اسد ہے نزع میں، چل بے وفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکین ہے



کیوں نہ ہو چشمِ بُبتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو
یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
و اے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گلِ دیکھ روتے یارِ یاد آیا اسد
جوشِ فضلِ بہاری اشتیاقِ نگیز ہے



دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کیے
یہ خُند کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
رہے ہے یوں کہ وہ بے کہ کہے دوست کو اب
زہے کہ رشتہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پُرسش حال
تمہیں نہیں ہے سرِ رشتہ وفا کا خیال
انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے؟
حسدِ نرے کمالِ سُخن ہے کیا کیجے!

ہو اُرقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کیے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کیے
اگر نہ کیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کیے؟
کہ بن کے ہی انہیں سب خبر ہے، کیا کیے
کہ یہ کہے کہ سرِ رگہز رہے، کیا کیے
ہمارے ہاتھ میں کُچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کیے!
ہمیں جواب سے قطع نظر ہے، کیا کیے!
ستمِ بہاے متاعِ ہنر ہے کیا کیے!

کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں، لیکن
سو اے اس کے کہ آشفقہ سر ہے، کیا کیے





دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جمع ہے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے
وہے، واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے!
ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ واہ!

کر گئی وابستہ تن میری عریانی مجھے
مرحبا میں! کیا مبارک ہے گرجانی مجھے
جانتا ہے محوِ پریشانی پناہی مجھے
لکھ دیا منجملہ اسبابِ ویرانی مجھے
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانِ مجھے
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
تم نے کیوں سوئی ہے میرے گھر کی دہانی مجھے
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غلِ خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب، یوسفِ ثانی مجھے





یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ "یارب" مجھے
سُجّہ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

ہے گُشاؤِ خاطرِ وابستہ در رہن سُنّ
تھا طلسم قُضِلِ احب، خانہ مکتب مجھے

یارب اس سُنّتگی کی داد کس سے چاہیے
رَشکِ آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

طبع ہے مُشتاقِ لذتِ ہائے حسرت، کیا کروں
آرزو سے ہے شِکستِ آرزوِ مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبِ مَیجی سے ہو گئے؟
عشق سے آتے تھے مانعِ میرزا صاحب مجھے!





حُصُوْرِ شاہ میں اہل سُنْحَن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحان آخر
نسیم مصر کو کیا پیر کنگساں کی ہوا خواہی
وہ آیا بزم میں دیکھو، نہ کیو پھر کہ غافل تھے
رہے دل ہی میں تیرا چھا، جگر کے پار ہو بہتر
نہیں کچھ سُبْحہ و زُنار کے پھندے میں گہرائی
پڑا رہ اے دل وابستہ، مینابی سے کیا حاصل
رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
چمن میں خوشنویان چمن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
ہنوز اُس خستہ کے زیرِ وے تن کی آزمائش ہے
اُسے یوسف کی بُجائے پیرین کی آزمائش ہے
شکیب و صبرِ اہل انجمن کی آزمائش ہے
غرض شستِ بُتِ ناوکِ فگن کی آزمائش ہے
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
مگر پھر تابِ زلفِ پُر شکن کی آزمائش ہے
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آویں گے مرے گھر؟ وعدہ کیا، دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب سپرخ کُن کی آزمائش ہے





کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جنائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
خُدا یا حُزبِ دِل کی مگر تائید اُلٹی ہے
کہ چٹنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طوفانی
عبارتِ مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، ادھر یہ ناٹوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی، کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
مکلف برطرف، نطّارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نَسبِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو حُشا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے



ز بسکہ مشق تماشا جُنوں علامت ہے
کُشاو و بستِ مژہ سیلی ندامت ہے

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعن بد عہدی
تجھے کہ آتنہ بھی وِطہ ملامت ہے

بہ پیچ و تاب ہوسِ سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجزِ سرِ رشتہ سلامت ہے

وفا مُقابل و دعوایِ عشق بے بنیاد
جُنوںِ ساختہ و فصلِ گل، قیامت ہے





لاغر اتنا ہوں کہ گر تُو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آجائے رحم
واں تلمک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دکھلاوے ، نہ دکھلا ، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلمک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زُلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے





بازیچہ اطفال ہے دُنیا مے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مے آگے
اک کھیل ہے اور نگہِ سیماں مے نزدیک اک بات ہے عجا زِ میحا مے آگے
جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جُز وہم نہیں ہستی اَشیا مے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مے ہوتے گھستا ہے حبسِ خاک پدیا مے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے تُو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مے آگے
سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں میں بیٹھا ہے بُتِ آنہ سیا مے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار رکھ دے کوئی سپنا نہ صہبا مے آگے
نفرت کا گلاں گزرے ہے، میں رشکِ گزرا کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کُفر کعبہ مے پچھے ہے، کلیسا مے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلے مے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مرنہیں جاتے آئی شبِ ہجراں کی تمنا مے آگے
ہے موزنِ اک قلمِ خوں کاش ہی ہو آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو، اچھا! مے آگے





کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیے
تھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کیے؟
نہ کیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستگر ہیں
مجھے تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو بجا کیے
وہ بیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کیے
نہیں ذریعہ راحت چراحت پیکال
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دکشا کیے
جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیے
کہیں حقیقت جانکاہی مرض لکھیے
کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجے
رہے نہ جان تو قاتل کو خونبھا دیجے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو، نگار تو ہے!
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے!
طراوت چمن و خوبی ہوا کیے

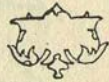
سفینہ جب کہ کنارے پہ آگیا غالب
خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کیے!





رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
 صرف بہائے مے ہوئے آلاستِ مسکیتی تھے یہ ہی دو حساب سوئوں پاک ہو گئے
 رسوائے دہر کو ہوئے آوارگی سے تم بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
 کہتا ہے کون نالہ بلبل کو بے اثر پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
 پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
 کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اُس نے اسد کی نعش
 دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

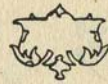
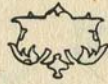


نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب شیشہ مے سرو سبز جو تبارِ نغمہ ہے
 ہم نشینِ مست کہ کہہ بہم کہ نہ بزمِ عیشِ دوست واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے





عرض نازِ شوخیِ دُنداں برائے خندہ ہے
دعوتی جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
بے عدم میں غنچِ پر محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
ورنہ دُنداں در دل افسردن بنائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احبابِ مُنکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے



حُسنِ بے پروا خریدارِ مستاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ خستِ راعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا بہت
چشمِ واگردیدہ آغوشِ فداعِ جلوہ ہے





جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی مشکل کہ تجھ سے راہ سُخنِ واکرے کوئی
عالم غمبارِ وحشتِ مجنوں ہے سرسبز کب تک خیالِ طرّہ لیلے کرے کوئی
افسردگی نہیں طربِ انشائے التفات ہاں دردِ بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیمِ ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عتدہٗ دل واکرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ واہوئی کیا فائدہ کہ جیب کو رُسا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خارِ شاخِ گل تا چند باغِ بانیِ صحرَا کرے کوئی
ناکامی نگاہ ہے برقِ نثارِ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر رنگِ وحشت ہے صدفِ گوہرِ شکست نقصان نہیں جُنوں سے جو سودا کرے کوئی
سُربِ ہوتی نہ وعدہٗ صبرِ آزا سے عمر فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجادِ یکس خیز یہ درد وہ نہیں کہ نہ پید کرے کوئی
بیکار مئی جُنوں کو ہے سرِ پٹنے کا شغل جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

سُخنِ فروغِ شمعِ سُخنِ دُور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پید کرے کوئی





ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کسان کا تیر دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر وال زبان کھتی ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سُنو، گر بُرا کہے کوئی نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنا کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی





بہت سی غم گیتی ، شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے!

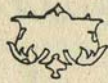
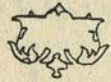
تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف ، تو ستم کیا ہے!

سُخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی ، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے!





باغ پا کر خفتانی یہ ڈراتا ہے مجھے
 سایہ شاخِ گلِ افعی نظر آتا ہے مجھے
 جو ہر تیغ بہ سرِ چشمہ دیکھ معلوم!
 ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے
 مدعا محو تماشاے شکستِ دل ہے
 آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
 نالہ سرمایہ یک عالم و عالم کفِ خاک
 آسمانِ بھیسہ قمری نظر آتا ہے مجھے
 زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
 دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے



رَوندی ہوئی ہے گو کبہ شہر یار کی
 جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
 اترے کیوں نہ خاک سرِ رگزار کی
 لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
 بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
 کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی





ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل، کیا رہے گا اُس کی گردن پر
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بھرم کھل جائے ظالم، تیرے قامت کی درازی کا
مگر لکھو اے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھو اے
ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آسما
ہوئی جن سے توقع خشکی کی داد پانے کی
محبت میں نہیں ہے فرق چلنے اور مرنے کا

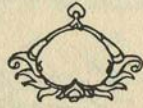
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر لویں دم بہ دم نکلے
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
اگر اس طرہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
ہوئی صبح اور گھر سے، کان پر رکھ کر قلم نکلے
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے
وہ ہم سے بھی زیادہ خشک تیغِ رستم نکلے
اُسی کو دیکھ کر جلتے ہیں جس کا فر پہ دم نکلے

کہاں مینجانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے



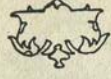


کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جائیے
بے تکلف، اے شدارِ جستہ! کیا ہو جائیے
بیضہ آسائنگِ بال و پر ہے یہ کُنچِ قفس
از سر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

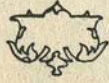


مستی، بہ ذوقِ غفلتِ ساقی، ہلاک ہے
موجِ شراب، یکِ مژدہِ خوابِ ناک ہے
جز زحیمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جُبنوں سے کچھ نظر آتا نہیں! سدا
صحرا ہماری آنکھ میں یکِ مُشتِ خاک ہے



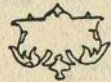


لبِ عیسیٰ کی جُنیش کرتی ہے گوارہ جُنِ بانی
قیامت کُشتہ لعلِ بُتاں کا خواب سُنکیں ہے



آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنکلی جادہ سے

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

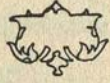


ہوں میں بھی تماشا فی نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

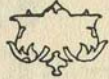




سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کا غز پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ٹائے جہاں کی



ہجومِ نالہ، حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشہ صد نیتاں سے خُس بنداں ہے
مکلفِ بر طرف، ہے جانتاں تر لطفِ بدخیاں
نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عسریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلفِ کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عیدِ مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے
دل و دین نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغرِ متاعِ دستگرداں ہے
غمِ آغوشِ بلا میں پرورشِ دُیا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا فِشلمِ صرصر کا مرجاں ہے





جس جانِ سیمِ شانہ کش زلفِ یار ہے
کس کا سُرِ اِغِ جلوہ ہے حیرت کو اُغلا
ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبارِ شوق
دل مدعی و دیدہ بنا مدعی علیہ
چھڑکے ہے شبِ نیم آئینہ برگِ گل پر آب
تجّ آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے
بے پردہ سوے وادیِ مجنوں گزرنہ کر
اے عندلیب یک کھنکھ بر آشیاں
دل مت گنوا بخت نہ سہی بسیر ہی سہی
نافہ و ماغ آہوے دشتِ تار ہے
آئینہ فرشِ شش بہت انتظار ہے
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے
نظارے کا مُفتِ دم پھر روبرو کار ہے
اے عندلیب وقت و دِارع بہار ہے
وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے
ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے
طوفانِ آمد آمدِ فصل بہار ہے
اے بے دماغ آئینہ شمال دار ہے

غفلتِ کفیلِ عمر و اسدِ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگساں تجھے کیا انتظار ہے





آئینہ کیوں نہ دُوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستہ بنگاہِ سُویدا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسوں انتظانِ تمنا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ عنبرِ سی سے ڈالے
وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عنانِ گسیختہ، دریا کہیں جسے
درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صُبحِ بہار، پُنبہِ مینا کہیں جسے

غالب بُرا نہ مان جو واعظِ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟





شبِ نم بہ گُلِ لالہ نہ خالی زِ ادا ہے
دلِ نعلِ شدہ کُشکُشِ حسرتِ دیدار
شعلے سے نہ ہوتی، ہو سِ شعلہ نے جو کی
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بہ صد ذوق
قمری کُفِ خاکستر و بلبلِ قفسِ رنگ
خونے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
مجبوری و دعوایِ گرفتاری اُلفت
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
اے پر تو خورشیدِ جہاں تابِ ادھر بھی
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
داغِ دل بے دردِ بطنِ گاہِ حیا ہے
آئینہ بہ دستِ بُتِ بدستِ جنا ہے
جی کس قدر افسردگیِ دل چلا ہے
آئینہ بہ اندازِ گُلِ آغوشِ کُشا ہے
اے نالہ! نشانِ جگر سوختہ کیا ہے
معشوقی و بے صُغلی طُرفِ بلا ہے
دستِ ترِ سنگِ آمدہ پیمانِ وفا ہے
تیغِ ستمِ آئینہ تصویرِ نما ہے
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ حُسنِ قس سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان، خدا ہے



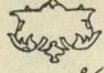


منظور مہتی یہ شکل تجلی کو نور کی
اک خوشچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
واعظ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلاسکو
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اٹھا؟
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
گرمی سہی کلام میں بسیکن نہ اس قدر

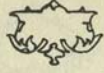
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ چور کی
کیا بات ہے تمہاری شرابِ ظہور کی
گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صُور کی
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طُور کی
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبتِ دُور کی
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی
کی جس سے بات اُس نے شکایتِ ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
جج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی





غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلغام بہت ہے
کتے ہوئے ساقی سے جیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُرُوتہ جام بہت ہے
نے تیرکماں میں ہے، نہ صیاد کیں میں
گوشتے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گر چہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمع خام بہت ہے
ہیں اہلِ ضرر کس روشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے
زرم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے؟
آلودہ بے مے جامہٴ اصرام بہت ہے
ہے قمر گر اب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے؟
شاعر تو وہ اچھا ہے یہ بدنام بہت ہے



مَدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
 کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
 پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
 پھر گرم نالہ ہائے شہر بار ہے نفس
 پھر پریش جراحِ دل کو چلا ہے عشق
 پھر بھر رہا ہوں حسامۂ مہرگاں بہ خونِ دل
 باہر گر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
 دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جاے ہے
 پھر شوق کر رہا ہے حیدر کی طلب
 دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
 پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
 مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بامِ پرہوس
 چاہے ہے پھر کسی کو نعمتِ بل میں آرزو
 اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
 پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
 جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ راتِ دن

جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے
 عرصہ ہوا ہے دعوتِ مہرگاں کیے ہوئے
 برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیے ہوئے
 مَدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
 سامانِ صد ہزارِ نسکداں کیے ہوئے
 سازِ چین طرازِ می داماں کیے ہوئے
 نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
 پندار کا صنمکدہ ویراں کیے ہوئے
 عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
 صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
 جانِ نذرِ لہنی بی عنوان کیے ہوئے
 زلفِ سیاہِ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
 سرے سے تیز و شنہ مہرگاں کیے ہوئے
 چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
 سرزیرِ بارِ منتِ دہباں کیے ہوئے
 بیٹھے رہیں تصوّرِ حبا ناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑے کہ پھر جوشِ اشک سے
 بیٹھے ہیں ہم تہیتِ طوفان کیے ہوئے



نَویدِ اَمْنِ ہے بیدادِ دوستِ جاں کے لیے رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے اگر مژدہ یارِ تشنہ خوں ہے رکھوں کچھ اپنی بھی مگر کانِ خوں فشال کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خُلق لے خضر نہ تُم کہ چور بنے عسکرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی میں مبتلا ہے آفتِ رشک بلا ہے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے
فلک نہ دُور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں دراز دستیِ قابل کے امتحاں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر کرے قفس میں فراہمِ خس آسماں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئے اٹھا، اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنا سے غزل ق کچھ اور چاہیے وسعتِ مرے بیاں کے لیے
دیا ہے خُلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے بنا ہے عیشِ تجسُّلِ حُسنِ خاں کے لیے
زباں پہ بارِ حُند آیا! یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں اور مُعینِ مِلّت و مُلک بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستیاں کے لیے
زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
وَرَقِ تَمَام ہوا اور مدحِ باقی ہے سفینہ چاہیے اس سحرِ بے کراں کے لیے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

